**سید زاہد حسین کاظمی**
پی ایچ ڈی اسکالر، نمل یونیورسٹی اسلام آباد
**ڈاکٹر رخشندہ مراد**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

# ۱۹۴۷ء سے قبل تحریر کردہ اُردو آپ بیتیوں میں برطانوی استعمار کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

**Abstract:**
Any writing is a reflection of contemporary era and society. Writers describe the real facts about society through so many artistic devices. There have been so many studies about colonialism and post clonialism. Actually colonialism was depicted in all jeners of literature. Especially autobiographies written before the establishment of Pakistan are valuable record of the condition which the colonies encounter. Autobiographies shows all the forms of exploitation, humiliations and despotism by the colonizer. In this article writer analyses the deep rooted elements of political dependence of colonizer, his policies to sustain the colonialism by all means. In the context of colonialism in India by British Empire, this article elaborates the educational policies of English colonizers in the name of enlightenment but actually these educational reforms converted the India to illiterate Nation.

یوں تو آپ بیتی ایک نثری صنف ہے جبکہ منظوم صورت میں بھی اردو آپ بیتیاں موجود ہیں جن میں حمایت علی شاعر کی "آئینہ در آئینہ" اور علامہ فضل حق خیر آبادی کی "قصائد فتنتہ الہند" قابل رشک اور اردو ادب میں خوبصورت اضافہ ہیں۔ آپ بیتی جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ خود پر بیتے حالات کی کہانی یا امتداد زمانہ کی ادبی تاریخ ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ ایک ایسی تحریر ہے جسے ادبی تاریخ کا درجہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ جس میں لکھاری اپنی زندگی میں پیش آنے والے اہم حالات و واقعات کو ایک ترتیب سے تحریر کرتا چلا جاتا

ہے کیونکہ وہ ان پے در پے پیش آنے والے حالات و واقعات کا چشم دید گواہ بھی ہے اس لیے اسے تاریخی اور سندی اعتبار سے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ آپ بیتی کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ یہ عمر کے اس حصے میں لکھی جاتی ہیں کہ جب لکھاری اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ گزار چکا ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے ان ماہ و سال سے گزر رہا ہوتا ہے کہ وہ حالات زمانہ کو بے کم و کاست ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ ماہر تجربہ کار، اعلیٰ قوت مشاہدہ رکھنے والا اور صاحب مطالعہ شخص سادگی اور روانی سے ان حالات کو قلم بند کرتا ہے۔

بقول علم الدین سالک:۔

> "آپ بیتی" اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسان، خود اس کا آغاز انسان کے ساتھ ہوا۔ زمانے کی گردش نے آپ بیتیوں کے نام و نشان مٹا دیے۔ تاہم بعض زبانوں میں آج سے ہزار ہا سال پہلے کی لکھی ہوئی آپ بیتیاں موجود ہیں۔(1)

قیام پاکستان سے قبل آپ بیتیوں کا جائزہ لیا جائے۔ تو ان میں مابعد نوآبادیات اور رد استعماریت کے تناظرات ملتے ہیں۔ جن میں سے چند کے نام ذیل میں درج ہیں۔ "اعمال نامہ" از سر سید رضا علی، "آپ بیتی" مولانا عبدالماجد دریاآبادی، "گرد راہ" ڈاکٹر اختر رائے پوری، "حیات نساخ" از عبدالغفور نساخ، "داستان غدر" از سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی، "قید فرنگ" از سید فضل الحسن حسرت موہانی، "آپ بیتی" از خواجہ حسن نظامی، "نقش حیات" از مولانا سید حسین احمد مدنی، "ناقابل فراموش" از دیوان سنگھ مفتون، "میرا افسانہ" از چوہدری افضل حق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جبکہ "الثورۃ الھندیہ" از علامہ خیر آبادی، "کالا پانی" از محمد جعفر تھانیسری، "پس دیوار زندان" از شورش کاشمیری نے ان آپ بیتیوں میں اپنے پر گذرے حالات کے علاوہ زمانے کے جبر کی خاص ڈائری بھی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ انہی ادوار کے مماثل تاریخی حقائق بھی منظر عام پر عیاں ہو رہے ہوتے ہیں۔ جن سے مصنف پہلو تہی نہیں کر سکتا بلکہ وہ ان حالات و واقعات کو من و عن تحریر کرتا چلا جاتا ہے۔ معاشرتی حقائق کو منظر عام پر لا کر عوامی آگہی، معاشرتی چیرہ دستیوں، معاشرتی اقدار اور ثقافتی رنگوں کو واضح کرتا ہے تاکہ وہ اس دور کی ادبی وراثت کو اگلی نسلوں تک پہنچا سکے حالانکہ یہ حالات و واقعات، گزاری گئی زندگی اور اس سے جڑے ہوئے تمام اچھے برے خیالات، رنج و آلام کا اظہار ہے۔ یہ کہانی فرضی یا تخیل آفرینی سے پاک ہوتی ہے۔ لکھاری اسے اپنے اسلوب میں ڈھال کر قاری تک پہنچاتا ہے۔ آپ بیتی ایک تاریخی دستاویز کا درجہ بھی رکھتی ہے یہ بین

الاقوامی حالات کو بغیر کسی کمی بیشی کے پیش کرتی ہے۔ دنیاوی سطح پر جو بتدریج تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا علم ہمیں انہی کے ذریعے ہوا ہے۔

ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:۔

> خود نوشت سوانح نگار کا کام عام اوصاف اور نمایاں مظاہر کا مشاہدہ کرنا ہے. سر کے بالوں کا شمار یا آنکھ کی پتلی کی رنگت میں مختلف سایوں کے امتزاج کی تشریح نہیں۔ اسے اپنے ذاتی مرقعے میں ایسے اہم اور ممتاز خدوخال کے نمائش کرنی ہے جو ہر ذہن میں اصل کی یاد تازہ کر دیں۔ (2)

اگر نو آبادیاتی نظام کی اصطلاح کا جائزہ لیا جائے کہ یہ کب وجود میں آئی تو اس کے بارے میں مطلقاً اظہار ممکن نہیں لیکن اتنا بتایا جاسکتا ہے کہ اس کی ابتدا مصریوں، فونیقیوں اور یونانیوں سے ہوئی بعد ازاں اسلامی دور میں بھی نو آبادیاں قائم کی گئیں۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب تین بڑی نو آبادیاتی قوتیں تھیں۔ جن میں روسی، عثمانی اور آسٹریائی اقوام شامل تھی پھر برطانیہ سب سے بڑی قوت بن کر ابھری اور پھر اس کے بعد فرانس، اٹلی اور ڈچ نو آبادیاتی قوتوں کے طور پر نمودار ہوئے۔ نو آبادیاتی نظام ایک ایسا طرز حکمرانی کہ جس کے ذریعے طاقتور اقوام دوسرے ممالک کے علاقوں پر قابض ہو کر اپنی حکومت قائم کرتے ہیں اور پھر وہاں اپنی نئی آبادیاں قائم کرتے ہیں اور وہ گاہے گاہے اسے توسیع دیتے رہتے ہیں۔ جس سے ان کی سلطنت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پھر اس کے بعد ان علاقوں میں اپنی معاشرت کو رواج دینے اور اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے سخت قوانین بناتے ہیں اور پھر وہ آہستہ آہستہ اس علاقے کی عوام کو زبردستی محکوم بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نہ صرف ان سے جبری مشقت کرواتے ہیں بلکہ ان کے ملکی وسائل سے بھرپور استفادہ بھی کرتے ہیں۔ سہیل احمد لکھتے ہیں:

> "رد نو آبادیاتی تنقید سامراجی قدروں اور نظریات کو ہی نشانہ ہدف نہیں بناتی بلکہ دیگر جمہوری, معاشرتی اور سیاسی نظاموں میں چھپے ہوئے. نو آبادیاتی ,امراجی عناصر کو بھی شناخت کر لیتی ہے"(3)

مابعد نو آبادیات تنقید کا وہ نظریہ ہے۔ جو ایسے حالات میں پیدا شدہ صورتحال کا جائزہ لیتا ہے اور وہ اس نئی صورتحال میں حاکم و محکوم کے ان نئے تعلق کا مطالعہ کرتا ہے کیونکہ یہ تعلق طاقت کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اسے

بے جوڑ تعلق بھی کہا جا سکتا ہے اور ایسے تعلقات دو طبقات کو جنم دیتے ہیں۔ ایک طبقہ حاکم جو "استعمار" کہلاتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ محکوم جو "استعمار زدہ" کہلاتا ہے. استعمار کار اور استعمار زدہ کا بے جوڑ تعلق جو جبر و استبداد کے غیر منصفانہ رویوں سے ظاہر ہوتا ہے اور انہی رویوں کی وجہ سے استعماریت کی اصطلاح متعارف ہوئی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نوآبادیات اور استعماریت دونوں یک جان دو قالب ہیں کیونکہ استعماریت نوآبادیاتی نظام کی عملی شکل ہے۔ جس کی مدد سے وہ ان نوآبادیوں میں ان لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے سیاسی، معاشی، آئینی اور تعلیمی اصلاحات متعارف کرواتا ہے اور استعمار کار اس نظام کو نافذ کرتا ہے تاکہ اس کو تمام شعبہ جات پر مکمل برتری حاصل ہو اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ اپنا مکمل قبضہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بنائے گئے عوامی بہبودی قوانین کے ذریعے اسے مکمل بالادستی رہے۔ اس کے نفوذ کی گئی ثقافت اور تعلیمی اصطلاحات اس کے تعلق کا تجزیہ کرتی ہیں۔ جو اس نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس معاشرے میں رواج دینے کے لیے کوششیں کیں اگر ہم یہ کہیں کہ مابعد نوآبادیاتی عہد نوآبادیات کی ایک نئی شکل ہے اور یہ نئی بنیاد اسے جاری و ساری رکھنے میں معاون ہے کیونکہ اس نظام کی عالمگیریت آج بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے اور وہ انہی علاقوں کو مختلف ہتھکنڈوں سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے اور ان علاقوں میں اس نے ایسی صورتحال پیدا کر رکھی ہے کہ کوئی بھی ملک آزاد اور خود مختار ہوتے ہوئے بھی ان کے چنگل سے آزاد نہیں ہے اب وہ ممالک اتنے طاقتور ہیں کہ انہوں نے ابھی تک ان ممالک کو اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیا- معیشت ہو یا سیاست، ثقافت ہو یا معاشرت سب ان کی دسترس میں ہیں اور وہ انہیں اپنے گماشتوں کے ذریعے اور مختلف ذرائع سے عوامی رائے عامہ ہموار کر کے نفوذ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں اور عوام کو اپنی حکومتوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان ممالک کی خارجہ پالیسی اپنی محسوس ہوتی ہے حالانکہ وہ بھی انہی کے مرہون منت ہے۔ اگر ظاہری طور پر جائزہ لیا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ یہ ممالک ہمارے ہمدرد، خیر خواہ اور ہماری ترقی میں مددگار ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے وہ اپنے حیلوں بہانوں سے ہمیں مقروض اور دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس میڈیائی دور میں بھی عوام اور حکمرانوں کو ذہنی غلام بنائے ہوئے ہیں اس کو آج کل ففتھ جنریشن وار کا نام دیا جاتا ہے۔

مابعد نوآبادیات ایک ایسا تاریخی و ادبی عمل ہے جو کہ نوآبادیات کے تناظر میں پیدا شدہ صورتحال کا تجزیہ کرتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر سیاسی، معاشی، ثقافتی اور سماجی غلبے کے مضمرات کو آشکارہ کرتی ہے۔ رابرٹ جے سی یونگ لکھتے ہیں:-

"Post colonialism claims the rights of the people on this earth to the same material and cultural well being"(4)

مابعد نوآبادیات کا دعوی ہے کہ وہ لوگوں کی فلاح و بہبود کی علمبردار ہے اور جب تک دنیا میں ظلم و زیادتی کو جواب دہ نہیں بنایا جاتا اور جب تک انہیں پر آشوب حالات سے نہیں نکالا جاتا اس وقت تک "استعمار زدہ" سے تعلق قائم رہے گا۔ اگر ان زمینی حقائق کا ادراک کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سامراج تو اپنی جگہ چھوڑ گیا ہے لیکن اس کا بنایا ہوا نظام زندگی ابھی تک مجبوروں کی زندگیوں کو اجیرن بنائے ہوئے ہے۔ یہ وہی نظام زندگی ہے جسے انہوں نے اپنی فلاح کا ذریعہ سمجھا اور کئی سالوں تک وہ اسی نظام کا حصہ رہے۔ مابعد نوآبادیات کا نظریہ ایک ایسا نظریہ بنا جس نے استعماریت کے پیدا کردہ حیلوں اور ان کی ناپاک چالوں کو واشگاف کیا لیکن یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ہم سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے بنائے ہوئے چنگل سے اپنے آپ کو آزاد کروا سکیں۔ یہ ایک ایسا دلدل ہے کہ اس میں دھنستے ہی چلے جاتے ہیں۔ قوموں کی اٹھان ان کے کردار و عمل سے ہوتی ہے۔ جب تک ہم اسے اہمیت نہیں دیں گے اس وقت تک یہ خام خیالی ہے

قدرت نے برصغیر کو کئی حوالوں سے نوازا ہے۔ اگر اس کا جائزہ جغرافیائی سطح پر لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطہ زمین عطیہ خداوندی ہے۔ جہاں دنیا و جہاں کی تمام نعمتیں اور موسم موجود ہیں اور یہ کئی حوالوں سے پر کشش ہے اس لیے یہ استعمار کا ترنوالہ بنا دیا۔ یورپ نے خوب ترقی کی، طرح طرح کی مشینیں ایجاد کر کے ایک بھرپور مشینی دور سے گزرے لیکن خام مال کی کمی آڑے آتی تھی۔ ان مشینوں کو چلانے کے لیے انہیں خام مال کی ضرورت تھی اور یہ خطہ ارض قدرتی وسائل سے لبریز تھا۔ جس میں وسیع میدان، دریا اور پائیدار ندی نالے موجود تھے۔ اس کے ساتھ مقامی اور علاقائی ہنر مندی بھی قابل ذکر تھی۔ اس کے علاوہ مقامی لوگوں کی جفاکشی قابل قدر تھی اس لیے شروع سے ہی استعمار کی ان پر نظر تھی اور اس نے اس خطہ ارض کے خزائن کو بڑی بہادری اور دلیری سے لوٹا اور اپنے ملکی کارخانوں سے استفادہ کرتے ہوئے عالمی منڈیوں تک رسائی حاصل کی اور اپنی معیشت بہتر کی۔ یہ سہرا کسی ایک قوم کے سر نہیں ہے بلکہ کئی اقوام نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ان خزائن پر اپنے ہاتھ صاف کیے۔ ترکوں، ایرانیوں اور یونانیوں نے بھی اپنی استعداد کار کے مطابق کام دکھایا پھر انہوں نے اپنی سہولت کے مطابق تجارتی اصول و ضوابط بنائے اور استفادہ کرتے چلے گئے اور اس خام مال کو اپنی اپنی منڈیوں تک لے جاتے رہے۔

دوسری اقوام کی طرح برطانوی حکومت نے کچھ زیادہ ہی فیاضیاں دکھائیں نا صرف اس خطے کہ وسائل سے خوب استفادہ کیا بلکہ وہ اپنی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے پہلے تجارت کی اجازت لی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے ٹھکانے بنا کر سکونت اختیار کی اور ساتھ ہی سازشوں کی پٹاری کھول دی۔ اور مقامی حکومت کو کمزور کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کے ساتھ خوب قتل و غارت گری کی اور آخر کار اپنی ان کاوشوں میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے تقریباً سو سالہ جہد مسلسل کے بعد قبضہ حاصل کیا اور اس خطے کے نظام حکومت کو تہس نہس کر دیا اور اپنا نظام حکومت قائم کرنے کے لیے اپنے اصول و ضوابط وضع کیے اور مقامی لوگوں کا اعتماد جیتنے کے لیے ان کے ساتھ تجارت کو بڑھاوا دیا اور ان کی زبانوں کو سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ادارے قائم کیے اور اس طرح زبان و ثقافت کو سمجھنے کے لیے مختلف کتب کے تراجم کروائے اور ان کا گہرا مطالعہ کیا اور آہستہ آہستہ معاشرت سیکھ گئے۔ یہاں استعماریت کے ایک حربے کی مثال مناسب دیکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر گوٹلیب ولیم لینٹنر اپنی ریسرچ میں لکھتے ہیں کہ 1849ء میں جب انگریز پنجاب پر قابض ہو گئے تو پنجابیوں کو اپنی زبان و ثقافت سے دور کرنے کے لئے پنجابی قاعدے خریدے گئے۔ بالآخر وہ قاعدہ ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ جو شخص تلوار واپس کرتا اسے "ایک آنا" دیا جاتا جبکہ جو پنجابی قاعدہ جمع کرواتا اسے "چھے آنے" دیے جاتے تھے اور یوں وہ اپنی حیلہ گری میں کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں کو جاری رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے قبضہ حاصل کرنا شروع کر دیا اور خانہ جنگی شروع کروا کر معاشرتی ابتری پیدا کی گئی۔ لوگوں میں بداعتمادی اور بے اعتباری کے فضا پیدا کر دی گئی۔ جس کے نتیجے میں اس خطے کے بہادر اور عظیم سورماؤں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ان کے مکاریوں کے ساتھ ہمدردانہ رویے، مطلبی لوگوں کی پذیرائی نے اپنوں کو بیگانہ کر دیا اور دھیرے دھیرے پورے برصغیر کو گردن سے دبوچ لیا اور ان لوگوں کی ذہن سازی کی گئی اور اس کے ساتھ ان کے منہ میں اپنے الفاظ ٹھونسنا شروع کر دیے۔ یہ چالاکی، مکاری، منافقت اور دوغلا پن کی عمدہ مثال ہے۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:-

> "نوآبادیاتی عہد میں محکوم ملکوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کے لیے آئیڈیالوجیکل طریقے اختیار کیے گئے مگر ان کا اثر وہی ہوا جو نفسی تشدد کے نتیجے میں کسی شخص کے حافظے پر ہوتا ہے اور وہ واقعات کو الگ الگ دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے"(5)

ان ہیجان آمیز رویوں اور نفسیاتی چالوں کی بابت معاشرتی انحطاط پیدا ہوا اور اپنی شناخت معدوم ہوتی گئی۔ برطانوی استعمار نے ترقی و خوشحالی اور آسودگی کے نام پر اپنے عزائم جاری رکھے۔ اس قوم کو ذہنی غلامی کی

طرف دھکیل دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد استعمار نے اپنے آپ کو مہذب، اعلیٰ وارفع اور روشن خیال ثابت کرنے کے لیے مختلف مقامی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے مزید کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان میں ایک کارنامہ فورٹ ولیم کالج کا قیام تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے ثمرات سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کے قیام کے محرکات سے بھی پہلو تہی کرنا ناگزیر ہے۔ ثقافتی رنگ میں ملاوٹ کرنے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اسی کا سہارا لیا گیا۔ اس کے بعد جدید تعلیم اور مقامی و ملکی سیاست کے اندر نفرت کا بیج بویا گیا۔ اس کالج میں مختلف علوم کا اجراء کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لوگوں نے اسے اپنی بقاو سلامتی اور خوشحالی سمجھتے ہوئے فائدہ مند سمجھا اور اس کے پس منظر میں استعمار کی حیلہ گری کو نہ بھانپ سکے۔ لیکن اگر حقیقی معنوں میں اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ کالج عوام کے لیے فائدہ مند رہا کیونکہ اس میں لوگوں کو ان علوم سے بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا جن علوم سے وہ پہلے واقف نہ تھے یا رسائی حاصل نہ تھی اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہ کالج اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے بہت فائدہ مند رہا۔ لوگوں میں اردو کے لیے دلچسپی پیدا ہوئی اور اردو کا شوق چڑھا، نایاب اور جدید کتب کے تراجم پڑھنے کو ملے اور آہستہ آہستہ جدید علوم کی طرف شوق پیدا ہوا۔ اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کالج کے قیام کے اسباب کلیتاً سیاسی تھے اور اس کا مقصد صرف لوگوں کا استحصال تھا۔ انہوں نے اپنی ملکی چالوں کے پیش نظر اس کے ذریعے ثقافتی لشکر کشی جاری رکھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ مذہبی رسومات کی پامالی شروع ہو گئی اور اس نے اتنا زور پکڑا کے مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے اور کچھ ہی عرصے بعد اس خطے کے لوگ باہم دست و گریبان ہو گئے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:-

> "فورٹ ولیم کالج کے محرکات سیاسی تھے لیکن اس کے ثمرات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ادب کو بھی متاثر کیا اور اردو نثر کی ایک موثر تحریک کو جنم دیا یہی وجہ ہے کہ اردو کا مورخ فورٹ ولیم کالج کو ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے"(6)

اگر عمیق نظری سے مشاہدہ کیا جائے تو حقائق مزید گھمبیر نظر آتے ہیں۔ سامراج کی استعاریت صرف برصغیر تک محدود نہ تھی۔ انہوں نے اپنی طاقت کے نشے میں دوسرے ممالک میں بھی اپنے جھنڈے گاڑے اور ظلم و بربریت کے جواہر دکھائے۔ ان ممالک میں مشرقی اور مغربی افریقہ، ساؤتھ افریقہ، ویسٹ انڈیز، مصر، برما، آسٹریا، امریکہ، ایسٹ ایشیا، نیوزی لینڈ وغیرہ شامل رہے ہیں۔ برطانوی استعمار نے اپنی جدت اور طاقت کا مظاہرہ کیا اور متذکرہ ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اپنی طاقت کا لوہا منوایا اور مکمل طور پر ان علاقوں کے ثمرات سے خوب استفادہ کیا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:-

"کلونیل ازم ایک نیا ڈرامہ تھا جس کا سکرپٹ یورپ نے لکھا اور جسے کھیلنے کے لیے ایشیا اور افریقہ کی سرزمینوں کو منتخب کیا گیا ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے تاہم کچھ معاونین اور ضمنی کردار ایشیائی و افریقی تھے"(7)

استعمار آج بھی اپنی نئی شکل میں برسرپیکار ہے۔ نئی حکمت عملیوں اور چارہ گری سے آج بھی ہر دل عزیز ہے لیکن اسے دیکھنے والی انکھ درکار ہے لیکن یہ ہماری موضوعاتی حد بندی سے باہر ہے۔ برطانوی استعمار کے متعلق مابعد نوآبادیات کا نظریہ ہمیں آگاہی دیتا ہے کہ انہوں نے اپنے مفادات اور اس کے تحفظ کے لیے جنگیں لڑیں، قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور اپنے مضموم مقاصد کی یاوری کے لیے اپنی پوری طاقت اس خطے میں جھونک دی اور برطانوی استعمار نے اپنے آپ کو ثابت کیا کہ وہ اکیلے ہی بہت بڑی طاقت تھی جو ناقابل شکست تھی کیا یہ کوئی جادوئی طاقت تھی یا یہ کوئی غیر مری طاقت تھی۔ نہیں ایسا نہیں تھا اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی یہ طاقت گولا و بارود سے زیادہ منصوبہ سازی کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چند ہزار برطانوی سول ملازمین نے ہندوستان کی سالوں پر محیط حکومت اور اتنی بڑی آبادی کو تگنی کا ناچ نچایا اور پھر اس کے بعد برطانوی استعمار نے اپنی زبان، تعلیم اور اپنی بہترین حکمت عملی سے ایک بہترین انتظامی نظام بنایا اور وہ اس خفیہ نظام سے اپنے تسلط کو وسعت دیتے رہے اور ان کی تدبیریں ہمیشہ مخفی رہیں۔ وہ اپنی شاطرانہ کھوپڑی سے یہ کرتب دکھاتے رہے اور حکومت کرتے رہے اور یہ سلسلہ سالوں تک محیط رہا۔ آخر کار یہاں تک کہ دوسری قوموں نے ان سے آزادی حاصل کی اور ساتھ ہی اپنے آپ کو ذہنی غلامی سے آزاد کرا لیا۔ لیکن برصغیر نے 1947ء میں آزادی تو حاصل کر لی لیکن ابھی تک ان کے چنگل سے آزاد نہ ہو سکے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم ابھی تک شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہیں۔ یہ ایک وسیع بحث ہے لیکن یہاں اس کا محل نہیں ہے۔

متذکرہ حالات و واقعات کا جائزہ قیام پاکستان سے قبل کی آپ بیتیوں کے تناظر میں لیا جائے تو ہمیں ان آپ بیتوں میں مابعد نوآبادیات اور رد استعماریت کے تناظرات واضح نظر آتے ہیں۔ "گرد راہ" اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بھی ہے کسی بھی آپ بیتی کو جگ بیتی سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کوئی بھی ادیب محض اپنی ذات میں مقید رہ کر نہیں لکھ سکتا۔ اس کی زندگی پر خارجی عوامل کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ جسے وہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے عہد شباب میں ہی برصغیر کی فرسودہ روایات اور معاشرتی ابتری کو بھانپ لیا تھا کیونکہ ان کا تعلق اس دور کے ادیبوں اور سیاست دانوں سے گہرا رہا ہے وہ معاشرتی قدروں کے حامی رہے ہیں اور یہ ایک فطری تقاضہ ہے کہ کوئی بھی شخص اس ابتلاء و آزمائش کے دور میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

۔اس دور کے ادباءاور شعرا نے اپنی طبع نازک کے باعث یہ اثرات زیادہ محسوس کیے اور اس دور میں جو بھی ادب تخلیق ہوا اس نے ان اثرات کو قبول کرتے ہوئے اس کے بر سر پیکار کچھ نہ کچھ حق ادا کیا آپ بیتیوں کے متعلق بات کی جائے تو حالات زمانہ کے علاوہ فکر و فن اور زعماء کے کارناموں نے اسے مستند مواد فراہم کیا۔ اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت "گرد راہ" جو کہ قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی لیکن اس کی طباعت اول بعد میں ہوئی اس سے قبل یہ آپ بیتی قسط وار "افکار" میں شائع ہوتی رہی. اس میں جہاں انہوں نے اپنے حالات زندگی بیان کیے ہیں وہاں ساتھ ہی انہوں نے سبق نمبر 7 تا سبق نمبر 8 میں "پاکستان ناگزیر تھا" کے عنوان سے قیام پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر کی بڑی عمدگی کے ساتھ منظر کشی کی ہے اور یہ خود ستائی اور بے باقی کی کیفیات سے بھری پڑی ہے۔ تجربات مشاہدات، حالات و واقعات کو انتہائی سادگی اور مربوط انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ جس سے اس دور کی زندگی کے خدوخال ابھر کر نظروں کے سامنے آجاتے ہیں یہ ان کی سچائی اور جرات کا واقعاتی اظہار ہے۔ اس آپ بیتی میں وہ برصغیر کے لوگوں کی ذہنی پسماندگی کا اظہار کھلے انداز میں کرتے ہیں۔ مقامی لوگ زمانہ قدیم کے بارے میں زیادہ اچھا گمان رکھتے تھے اور اسے آج کے دور کی نسبت زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھتے تھے حالانکہ پستی کا یہ عالم تھا کہ جہاز کو اڑن کھٹولا سمجھا جاتا تھا اور جب انگریز ڈپٹی کمشنر ٹیلی فون پر بات کرتا ہے تو چوکیدار سمجھتا تھا کہ صاحب شراب کے نشے میں دھت خود کلامی کر رہا ہے۔ لیکن اس منظر نامے میں کسی کو گمان تک بھی نہیں تھا کہ اگر سیاسی بیداری ہو گئی تو کایا پلٹ جائے گی اور برطانوی استعمار ہل جائے گا۔ رائے پوری لکھتے ہیں کہ "ترک موالات" کی تحریک اور "خلافت کی تحریک" نے وہ گھمسان کا رنگ ڈالا کہ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے سارا ہندوستان آزادی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ جلسے، جھنڈے، جلوس، اخبارات اور پمفلوٹوں، پوسٹروں اور گلی محلوں کی تقاریر نے قیامت برپا کر دی۔ انگریزوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ پوری قوم نے بدیسی مال کا بائیکاٹ کر دیا۔ ہر جگہ ہنگامے پھوٹ پڑے۔ ادبی محفلوں میں غزل کی بجائے قومی ترانوں کی گونج سنائی دینے لگی۔

اختر رائے پوری لکھتے ہیں کہ جب سر گرم کارکنوں کو پولیس پکڑ کر لے جاتی تو لوگ ان پر پھولوں کی بارش کرتے ایسے محسوس ہوتا جیسے شادی کیلئے بارات جا رہی ہو۔ چند سالوں میں طوفاں بپا ہو گیا۔ سینکڑوں لوگوں نے جام شہادت نوش کیا اور لاکھوں نے جیل کی یاترا کی۔ حکومت کا ظلم و جبر بڑھتا گیا یہاں تک کہ ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ گاندھی جی کا عدم تشدد کا فلسفے کے پیشِ نظر انہوں نے تحریک روک دی جس سے کانگرس کا شیرازہ بکھر گیا۔ سیاسی ہزیمت و انتشار کے دور کا آغاز ہوا۔ سانحہ "چوراچوری" ہوا. حقوق پر تقاریر ہوتی رہیں یہاں تک کہ سماج میں پھر جان پڑ گئی۔ زاویہ نگاہ بدلا اور ہر ایک کو اپنے حقوق کی پڑ گئی کیا طالب علم۔ تاجر، مولوی، پنڈت،

مزدور، کسان سبھی نے اپنا حصہ ڈالا اور ہڑتالیں ہونے لگی یوں معاملات زندگی درہم برہم ہونے لگے اور استعمار کو سمجھ آنے لگی کہ اب ٹھہراؤ مشکل ہے اور اس نے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

> "ایک اچھی آپ بیتی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کے لکھنے کے دوران میں واحد متکلم اپنی ذات کے مخفی گوشوں کو دریافت کرتا ہے۔ وہ خود سے باہر نکل کر دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ زمانے کے جزر و مد سے گزرتے ہوئے اس کے سراپا میں کیا کیا تبدیلیاں ائیں اور یہ تبدیلیاں اس کی شخصیت کو از سر نو مرتب کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئیں۔۔ اعلی پائے کی آپ بیتی کی حیثیت ایک تخلیق کسی ہوتی ہے، جسے ایک تخلیقی ذہن ہی وجود میں لانے پر قادر ہوتا ہے۔"(8)

اس طرح کی اردو ادب میں دوسری آپ بیتیوں کے علاوہ قبل از پاکستان لکھی گئی آپ بیتیوں میں ایک آپ بیتی "حیات نساح" ہے۔ جو کہ 1886ء میں شائع ہونے والی بنگال کے نامور شاعر و ادیب عبدالغفور نساح کی آپ بیتی ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے عہد کے سماجی و معاشی، معاشرتی حالات کے علاوہ وہاں کے رسم و رواج اور خوراک کا احوال بھی قلم بند کیا ہے۔ عبدالغفور نساح نے تیس برس تک بنگال میں ملازمت کی اور وہ برصغیر کے کئی مقامات پر تعینات رہے۔ وہ ادبی اور سادہ مزاج کے مالک تھے۔ وہ جہاں جہاں تعینات رہے انہوں نے ان مقامات کی معاشی و معاشرتی، سماجی و ثقافتی حالات کو بڑی عمدگی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی اس آپ بیتی میں انسانی ڈیل ڈول، خوراک، لباس اور پھلوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں اس دور کی تین سو سے زائد نابغہ روزگار شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دور کی تاریخ مرتب کی ہے۔ 1886ء میں نساح دہلی گئے اور اس عہد کی ادبی شخصیات سے انہوں نے شرف بازیابی حاصل کیا۔ جن میں مرزا غالب، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفی خان شیفتہ اور حالی شامل ہیں۔ وہ دہلی کے رویے اور ان کی بود و باش سے بڑے خوش ہوئے۔ لیکن اس بعد دوبارہ گئے تو اپنے ساتھ تلخ یادیں لائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ برطانوی استعمار نے اپنی حیلہ کاریوں سے علاقے کا ماحول ہی بدل دیا۔ خلفشار، افراتفری اور بے یقینی کی کیفیت نے ڈھیرے ڈالے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے سادہ اسلوب کی مدد سے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا۔ اس کو بہت عمدگی کے ساتھ لکھ دیا۔ وہ برصغیر کی تہذیب کو سمجھتے تھے اور انہوں نے اس تہذیب کا نمائندہ بن کے اس کی وضاحت کی۔

قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی ایک اور آپ بیتی "داستان غدر" ہے جو کہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی کی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1915ء میں شائع ہوا۔ ظہیر دہلوی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے منسلک اور داروغہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جنگ آزادی کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان کی یہ آپ بیتی حالات و واقعات کے لحاظ سے تاریخی صداقت کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی زندگی کے حالات و واقعات سے زیادہ، دہلی شہر کے کوچہ و بازار کے ساتھ دربار کی تصویر کشی بڑی عمدگی سے کرتے ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی کو انگریز غدر اور ہندوستانی جنگ آزادی کا نام دیتے ہیں جس نے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی منظر نامے کو یکسر بدل دیا کیونکہ یہ چشم دید گواہ تھے اس لیے وہ اس اندوہناک صورتحال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں ان حالات کو تفصیلا قلم بند کیا ہے۔ ان کی آپ بیتی کے کل دس ابواب ہیں۔ تیسرے اور چوتھے باب میں جنگ آزادی کی ہولناکیوں کا تذکرہ بڑی فصاحت سے ملتا ہے۔ جب کہ پانچویں سے دسویں ابواب میں ظہیر الدین نے جنگ آزادی کے اثرات کو بڑی جانفشانی سے نقل کیا ہے۔ ان کی دہلی شہر سے وابستگی، وہاں گزری ہوئی خوبصورت شامیں، رنگین محفلیں اور وہ دربار شاہی کی رونقوں کو یاد کر کے دلوں کو گداز کرتے ہیں۔

ظہیر الدین اُستاد ذوق کے شاگردوں میں سے تھے۔ جس طرح آزاد نے جدید اُردو نظم کی بنیاد رکھی بالکل اسی طرح ظہیر الدین ظہیر نے بھی اردو نثر کو فروغ بخشا۔ انہوں نے غدر کے حالات کو بڑی عمدگی کے ساتھ ضبط قلم کیا ہے۔ اور ان کے اس تحریر نے اُردو آپ بیتیوں کی ابتدائی تشکیل میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اس آپ بیتی میں "کشت و خون" کے عنوان سے وہ سامراج کی ستیزہ کاری اور استعماریت کے سر پر سوار بھوت کو بڑی اندوہناک انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ کے انتخاب سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے سپاہ انگریزی نے کشت و خون کیا، کوٹھیوں پر چڑھ کر خون ریزی کی گئی، رسد بند کی گئی، جس سے دانا پانی خلقت پر حرام ہو گیا اور قیامت صغری برپا کر دی گئی۔ یعنی ان خونچکاں واقعات کا ادراک کیا جائے تو دل منہ کو آتا ہے۔ ظہیر الدین ظہیر کا انداز بیاں افسانوی نظر آتا ہے جبکہ اس میں دہلی کی تہذیب و تمدن کا رنگ اور اس کا آہنگ بہت گہرا پایا جاتا ہے۔

یہ آپ بیتی بھی قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی۔ اس کا نام "قید فرنگ" ہے اور یہ "رئیس المتغزلین" کا لقب پانے والے سید فضل الحسن حسرت موہانی کی ہے۔ وہ تحریک آزادی کے جانباز کارکن، شاعر، ادیب اور عظیم صحافی کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے استعماریت کے ہتھکنڈوں، ان کی چالوں کو "اُردو معلی" میں آشکار کیا اور حکومت کے باغی کہلائے۔ بعد ازاں جب رہائی ملی تو ان کے حالات و واقعات "مشاہدات زنداں" کے نام سے شائع رسالے میں چھپے۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے فرنگی قید کی صعوبتوں اور مشکلات کا اظہار کیا ہے اور یہ اس

وقت کے کئی رسالوں کی زینت بنتی رہی بعدازاں شارق پبلی کیشن کراچی کے مالک شارق اقبال گاہندری نے "قید فرنگ" کے نام سے شائع کروائی۔ حسرت ملکی حالات و واقعات اور حکومتی جبر کو کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ 1907ء کو 1857ء کی جنگ آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر تقسیم بنگال کے حوالے سے بنگالیوں کا غم و غصہ بام عروج پر تھا اور حالات برطانوں استعمار کے قابو سے باہر ہو گئے جس کی وجہ سے بموں اور آتشیں اسلحہ کا استعمال بے دریغ ہوا۔ اس حالت زار نے سامراج کو شدید ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا۔ برصغیر پر جبر واستبداد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور سامراج کے سفاکانہ مظالم, مکروفریب اور ان کے مکروہ حیلوں سے ہندوستانیوں پر زمیں تنگ کر دی گئی۔ قصوروار اور بے قصور تمام لوگوں کو گرفتار کر کے قید بامشقت میں رکھا گیا۔ مصر میں انگریزوں کی پالیسی کے متعلق مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا۔ برطانوی استعمار نے انہیں باغی قرار دے کر دھر لیا گیا۔ حسرت کا یہ شعر اس قید بامشقت کی یاد دلاتا ہے جو استکبار نے ان کے ساتھ روا رکھا۔

ے ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت موہانی نے مسلم قائدین اور مخلص کارکنوں کے کٹھن حالات کو بڑی بے جگری سے تحریر کیا ہے۔ حسرت کی یہ کاوش استعماریت کے خلاف آہنی دیوار ثابت ہوئی۔

یہ خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی ہے اور یہ "آپ بیتی" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1919ء میں پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع ہوا۔ خواجہ حسن نظامی "آپ بیتی" میں وہ اپنی جدوجہد، اپنی قوم کی ستم ظریفی اور اس عہد کے معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پہلوؤں کا اظہار بھی کھل کر کرتے ہیں۔ ان کا انداز ہمیشہ واعظانہ رہا ہے۔ ان کے ہاں جہاں زندگی کے نشیب و فراز آئے وہاں انہوں نے تاریخی اہمیت کو ہمیشہ نمایاں کیا اور انہیں تلقین کی کہ وہ ایک حلال زندگی گزاریں، محنت کریں، قناعت پسند بنیں۔

خواجہ صاحب کے ہاں اصلاح احوال کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس دور کے شادی بیاہ، ثقافتی رسموں کو جذباتی انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہیں لوگوں کے ذہنی پسماندگی کا ہمیشہ قلق رہا اور اغیار اس سے استفادہ کرتا رہا۔ وہ بار بار لوگوں کو اصلاح احوال کے حوالے سے اپنے خطبات سے نوازتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی دہلی اپنی گود میں ہزاروں ارمان بھرے دلوں کا خون دیکھ چکی ہے اور روپیہ پیسہ استعمار کا ہتھیار رہا ہے۔ انہوں نے لوگوں کو اس سے باخبر کیا اور انہیں حلال روزی کی طرف گامزن کرنے پر لگے رہے۔

قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی آپ بیتیوں میں سر سید رضا علی کی آپ بیتی "اعمال نامہ" ہے۔ جو کہ 1943ء کو ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شائع کیا۔ آپ بیتی کے چودہ ابواب پر مشتمل ہے جبکہ چوتھے باب میں سیاسی اور اہم امور کے ساتھ ساتھ نواب وقار الملک، نواب محسن الملک کے حالات بیان کیے گئے ہیں جبکہ پانچویں اور چھٹے باب میں علی گڑھ کے قیام، تعلیمی سرگرمیاں اور خدمات کا ذکر ملتا ہے۔ نویں باب میں برصغیر کی سیاسی اور سماجی صورتحال کو مفصل انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ استعمار اپنی عیاری و مکاری سے باز نہیں آئے گا، ہمیں آگہی کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے یہ ہندوستان کی تاریخ و تہذیب, سیاست و ثقافت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس لیے اسے اردو ادب کی پہلی مکمل آپ بیتی کہا جاتا ہے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی کی آپ بیتی جو کہ قیام پاکستان سے قبل "نقش حیات" کے نام سے لکھی گئی۔ 1944ء میں مولانا "نینی جیل" میں قید و بند کی مشکلات سے گزر رہے تھے۔ تو انہوں نے چند احباب کے کہنے پر آپ بیتی لکھنے کا ارادہ کیا۔ مولانا اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ استعمار کی ہندوستان میں آمد مکاری و عیاری کے ساتھ مذموم مقاصد کا پیش خیمہ تھی اور ان کے اقتدار کا عروج و زوال، ان کی حیلہ گری، مکر و فریب اور پس پردہ عزائم بے نقاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے تحریک حریت کے اسباب و اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا نے آپ بیتی میں ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ جامع انداز میں کیا ہے اور انقلابی تحریکوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو بھی مفصل انداز سے تحریر کیا ہے۔ مسلمانان ہند کی مذہبی اور سیاسی زندگی کے حالات کو بھی اپنی آپ بیتی کی زینت بنایا ہے اور یہ آپ بیتی چھپ کر 1952ء کو منظر عام پر آئی۔

آپ بیتی ہی کے نام سے ایک خود نوشت "آپ بیتی" کے عنوان سے ہے اسے عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا حالانکہ یہ آپ بیتی 1979ء میں چھپ کر سامنے آئی جبکہ اس میں قیام پاکستان سے قبل کے حالات و واقعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مولانا ان حالات و واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے ہندوستانیوں کی پالیسی کو سرکار انگریز کی حمایت و تائید میں پایا۔ تمام قومی لیڈراں و اخبارات سبھی اس عقیدے کے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے دادا کو 1857ء کی جنگ آزادی کی پاداش میں نو برس "کالا پانی" کی سزا سنائی گئی کیونکہ انہیں عدالت سے سرکار کا باغی ثابت کیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ 1919ء میں تحریک خلافت اور ترک موالات کا زور ہوا۔ ہم گلی کوچوں میں جلسے جلوس منعقد ہونے لگے۔ مجھے گاندھی اور مولانا محمد علی سے دلی لگاؤ تھا۔ اجمیر شریف جا کر گاندھی جی سے جیل میں ملاقات کی اور یوں استعمار کے خلاف زور بڑھتا گیا اور میں بھی تحریری و تقریری سطح پر شامل رہا۔

"ناقابل فراموش" دیوان سنگھ مفتون کی لکھی ہوئی ہے یہ آپ بیتی 631 صفحات پر مشتمل ہے اور یہ 1957ء میں چھپ کر منظر پر آئی۔ یہ ایک بہترین خود نوشت ہے۔ مصنف نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو بہترین انداز سے پیش کیا ہے۔ دیوان سنگھ مفتون نے آپ بیتی میں جن استعماری موضوعات کو عنوان بنایا ہے ان کا لب لباب یہ ہے کہ برصغیر کے مذہبی اور سیاسی حالات میں کشیدہ صورتحال کی ذمہ دار انگریز سرکار ہے کیونکہ انہوں نے بین المذاہب ہم آہنگی کی بجائے نفرت و عناد کا بیج بویا۔ انگریزوں کی چال بازیاں اور مکاریاں نے جلد ہی معیشت کو تہہ و بالا کر دیا۔ ہندوستان کی سیاست اور سیاست دانوں کے طرز عمل کو اپنی طاقت بنانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ اور انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر اپنے تعاون کو دوام بخشا لیکن جلد ہی ہندوستانی ان مکاریوں کو سمجھ گئے اور مزاحم ہوئے

آپ بیتی کا عنوان "میرا افسانہ" ہے اور یہ چوہدری افضل حق کی آپ بیتی ہے اور ان کا تعلق پنجاب کے راجپوت خاندان سے تعلق تھا۔ اور یہ پہلی دفعہ 1943ء کو تاج کمپنی لاہور والوں نے شائع کیا۔ چوہدری افضل حق ادیب اور سیاسی رہنما تھے۔ وہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے سب انسپیکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ لیکن عطاءاللہ شاہ بخاری سے متاثر ہونے کی وجہ سے تحریک خلافت سے وابستہ ہوئے اور نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔ تحریک خلافت سے وابستگی کی وجہ سے انہیں جیل کی مشکلات برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن انہوں نے استعماریت سے ٹکرانے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد انہوں نے مسلمانان ہند کی بھرپور ترجمانی کی۔ وہ پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ نہرو رپورٹ سامنے آنے کے بعد چوہدری افضل حق اور عطااللہ شاہ بخاری نے مل کر 1929ء میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی۔ چوہدری صاحب تحریک مجلس احرار کا دماغ سمجھے جاتے تھے۔ وہ سیاست کے ساتھ ایک مذہبی شخصیت کے مالک بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ اور ان کی سیاسی چالوں نے مسلمانوں کو اکٹھا ہونے پر مجبور کیا اور وہ اپنے نصب العین کو لے کر اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔

قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی آپ بیتی "قید یا غستان" شیخ محمد اکرم صدیقی کی ہے جو کہ 1912ء میں شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی استعمار کی بے حسی کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور صدیقی صاحب نے انتہائی مغموم اور دل گداز انداز تحریر کیا ہے۔ وہ برطانوی ملٹری سروسز میں بطور اوور سیئر ملازم تھے اور بنوں کے علاقہ ٹوچی میں تعینات کر دیے گئے اور وہ انجینیر تھے۔ برطانوی استعمار کے خلاف عمومی فضا قائم تھی کیونکہ ہندوستانیوں کی معیشت تنگ کر دی گئی تھی اور ہندوستانی انہیں اپنی زبوں حالی کا مرتکب سمجھتے تھے اس لئے "یاغستان" پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع قبائلی علاقہ ہے۔ 1910ء میں ایک حادثہ رونما ہوا کیونکہ صدیقی صاحب برطانوی ملٹری کے ملازم

تھے انہیں تاوان کی غرض سے اغوا کر لیا گیا۔ اغواکاروں کی معاشی حالت بہتر نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور وہ انگریز سرکار کے سخت مخالف تھے۔ صدیقی صاحب اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ انگریز سرکار کو بھی اپنے ان ہندوستانی کارندوں سے اتنا لگاو تھا کہ میرے اور رفیق لالہ سندر لال کی رہائی کے لئے 12 ہزار روپے تاوان کا مطالبہ کیا گیا لیکن برطانوی سرکار نے تاوان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ آپ بیتی بڑی اندوہ ناک اور سبق آموز ہے۔ ان کی آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ استعمار کی بے حسی، سرحد کے حالات سے بے اعتنائی، وسائل کی لوٹ کھسوٹ، کمزور انتظامی ڈھانچہ، افغانستان کی سیاسی صورتحال اور دن بدن معاشی و معاشرتی گراوٹ تنزلی کا پیش خیمہ بنی۔

کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے اور عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادیب اپنی تحریروں میں معاشرے کے اصل حقائق کو علامت کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہی ادیب جب آپ بیتی تحریر کرتا ہے تو غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے علامت کا سہارا لیے بغیر واقعات قلم بند کرتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی آپ بیتیوں میں بھی ادبا نے مابعد نو آبادیاتی عہد اور استعماریت کے آنکھوں دیکھے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ مغلیہ دور کے زوال اور انگریزوں کے برصغیر آمد سے ہی برصغیر میں نو آبادیاتی عہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے برصغیر کے وسائل، تہذیب و ثقافت کو بری طرح متاثر کیا۔ اس دور کے ادبا کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے نو آبادیاتی عہد کو دیکھا اور مابعد نو آبادیاتی مطالعات سے استعماریت کے تناظرات کو اپنی تحریروں میں بعینہ بیان کیا۔

حوالہ جات:


1. سالک، علم الدین، "آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو"، مشمولہ، نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور 1964ء، ص:40
2. شاہ علی سید، ڈاکٹر، "اردو میں سوانح نگاری"، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، اشاعت اول، 1961ء، ص: 71
3. احمد، سہیل، "ردنوآبادیاتی تنقید"، مشمولہ: تسطیر، راولپنڈی، 1998ء، ص:122
4. Robert, J. C. Young, "an introduction to colonialism", Oxford, P.17
5. نیر، ناصر عباس، "مابعد نوآبادیات اُردو ادب کے تناظر میں"، کراچی، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2013ء، ص:4
6. انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، کراچی، انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ص:239
7. نیر، ناصر عباس، متذکرہ بالا، ص:6
8. وزیر آغا، پیش لفظ، "آپ بیتی کے توانا لہجے"، مرتب، قدرت اللہ شہزاد، ستلج پبلکیشنز، بہاولپور، 2004ء ص:ب